

سید مناظر احسن گیلانی

تقویٰ اور روزہ

© rasailojaraid.com

کون کون سے کام کرنے کے ہیں، اور کون سے نہ کرنے کے، تفصیلات میں تو اختلاف ممکن ہے، لیکن ان دو حصوں میں اعمال کی تقسیم، انسان کا فطری احساس ہے۔ کسی شخص کے متعلق جوں ہی پتا چلتا ہے کہ اعمال و افعال کی حد بندی کے تقاضوں سے آزاد ہو گیا ہے، اس کے پاگل ہو جانے کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ اگر تقویٰ کی واقعی حقیقت یہی ہے جو عرض کی گئی، تو پھر کتنی آسانی کے ساتھ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن کو، یعنی آئینی زندگی کے قدرتی دستور العمل کو، سپرد کرتے ہوئے، تقویٰ کے احساس کو چوتھانے والے اور جگانے والے عمل، یعنی روزے کی پابندی کا بھی ٹھیک اسی مہینے میں کیوں مکلف بنایا گیا، جس میں قرآن کے نزول کی ابتدا ہوئی۔ آئین و دستور کی پابندی کا مطالبہ باہر سے جن پر پیش ہو رہا تھا، ضرورت تھی کہ ان کے اندر بھی اس احساس اور جذبے کے اجاگر کرنے کا نظم کیا جائے جس پر آدمی کی آئینی زندگی کا دار و مدار ہے۔

یہ ہے ”تقویٰ“ اور ”قرآن“ میں تعلق۔ گویا آئین کے ساتھ آئین پسندی کے جذبے کو بھی سبب رکھنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ آدمی میں آئین پسندی یعنی تقویٰ کا جو جذبہ بنایا جاتا ہے، اس کے ابھارنے اور اس کو تروتازہ رکھنے میں روزہ سے کیوں مدد ملتی ہے؟

اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ چوبیس گھنٹوں میں بار بار جس چیز کی ضرورت آدمی کو ہوتی ہو، روزمرہ کی اسی ضرورت سے اچانک دست بردار ہو جانے پر آمادہ ہونے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ آئینی حدود کے اندر اپنے آپ کو روکے رکھنے کی پوری قوت اس کے اندر پائی جاتی ہے۔ سال کے گیارہ مہینوں میں جو کھا رہا تھا، پی رہا تھا، جنسی تقاضوں کی تکمیل پر جس کے کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی، وہی بارہویں مہینے میں اس امتحان میں کامیاب ہو کر نکلتا ہے کہ ساری چیزیں، جن کا گیارہ مہینوں میں عادی تھا، ان کو چھوڑ بیٹھا۔ آئینی جذبے کی مشق کی اس سے زیادہ بہتر صورت اور کیا ہو سکتی تھی۔

اب پڑھیے روزہ والی آیتوں کو۔ انصاف سے بتایا جائے کہ خود قرآن نے روزہ کے قانون کو نافذ کرتے ہوئے جو کچھ اس کے متعلق بیان کیا ہے، دل آویزی اور دل نشینی کی جتنی غیر معمولی توفیق اس میں پائی جاتی ہے، کیا عقل کے ناخن تراشوں کی تاویلوں میں اس کے بعد کچھ بھی جان رہ جاتی ہے۔ اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ روزہ اور اس کے اسرار و حکم اور وجوہ و مصالح کے سمجھنے کے لیے بجائے قرآن کے غیر قرآنی راہوں سے مدد لینے کی قطعاً حاجت نہیں۔

دوسرے مذاہب سے تعلق

روزے کے مطالبے کو مسلمانوں پر عائد کرتے ہوئے گزشتہ ادیان و مذاہب کو ماننے والی امتوں

کے ساتھ اپنے تاریخی رشتہ کا اعادہ کما کتب علی الذین من قبلکم کے الفاظ میں فرمایا گیا ہے۔

اس سے مسالوں میں یہ نفسیاتی اثر پیدا ہوتا ہے کہ اس حکم الہی کا بار اٹھانے میں وہ تنہا نہیں ہیں، بلکہ جو انسانی نسلیں ان سے پہلے گزری ہیں، وہ بھی اس میں ان کی شریک ہیں۔ اسی سے خود بخود یہ بھی سمجھ میں آ جاتا ہے کہ روز کا مطالبہ کوئی ایسا مطالبہ ہے بھی نہیں جسے بار سمجھا جائے۔ آخر جس کام کو تاریخ کے نام معلوم زمانے سے انسانیت برداشت کرتی چلی آئی ہے، اس کو بار اور بوجھ قرار دینے کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں۔ گویا برداشت کے لحاظ سے یہ تجربہ کیا ہوا، جانچا اور پرکھا ہوا عمل سے سمجھا جائے تو یہ اشارہ بھی قرآن کے الفاظ سے نہیں مل سکتا ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حیوانی ضرورتوں کے لیے حرارت، روشنی، ہوا، پانی وغیرہ جیسی قدرتی امدادوں کا آدمی ہر زمانے میں ہر جگہ محتاج رہا ہے، ایسی نوعیت قدرت کے ان قوانین کی بھی ہے جن کی پابندی کے بغیر انسان، انسان نہیں رہ سکتا۔ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ”انگوں پر بھی روزہ واجب کیا گیا تھا“ تو اس سے یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ روزہ بھی قدرت کے ان ہی قوانین میں شریک ہے جن سے نہ اگلے بے نیاز ہو کر رہ سکتے تھے اور نہ پچھلے اس سے مستغنی ہو سکتے ہیں۔

یورپ و امریکا کے علمی حلقوں میں آج کل مذاہب و ادیان کی تنقید و تحقیق کے سلسلے میں تقابلی مطالعے کو سب سے زیادہ عالمانہ طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ پہلے تو مذہبی پیشہ وروں، یعنی پادریوں نے اس کام کو شروع کیا تھا۔ بعد کو ان ہی پادریوں کی اولاد دوسرے علمی القاب اور خطاب کے ساتھ اسی کام کو ریسرچ اور تحقیق کے نام سے انجام دینے لگی۔ باور یہی کرایا جاتا ہے کہ تنقید و تحقیق کی ان راہوں میں کسی خاص مذہب یا دین کی پاسداری خیانت اور علمی بددیانتی سمجھی جائے گی۔ لیکن سارے پاپڑ و راصل کسی خاص مذہب کی تائید و حمایت ہی کے لیے بیسے جاتے ہیں۔

اس تقابلی مطالعے میں مختلف ادیان و مذاہب اور ان کے پیش کرنے والے بزرگوں کی تحقیر و تنقیص سے دامن ضرور آلودہ ہوتا ہے۔ تحقیر و تنقیص کے ان قصوں سے دلوں کو جو دکھ پہنچ جاتا ہے، یا پہنچایا جاتا ہے، دل آزاری کی جو آندھیاں چل پڑتی ہیں، ان کا رکنایہ روکنا ناممکن ہوتا ہے۔

اس بات میں غیروں سے نہ مجھے شکایت ہے، اور نہ شکایت کا حق حاصل ہے۔ مگر مسلمانوں میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ دعوت و تبلیغ کے قرآنی منبع خاص سے لاپرواہ ہو کر، کچھ لوگ کچھ دنوں سے ان ہی باتوں کی حوصلہ افزائیوں میں مشغول ہیں جن سے تقابلی مطالعے اور اس طریقے کے سارے مفاسد اور زہریلے فتنوں کی نشوونما میں مدد مل رہی ہے۔ دیکھتا ہوں اور دل ہی دل میں گھٹتا ہوں کڑھتا ہوں۔ قرآن سکھاتا ہے کہ بنی آدم کی جن جن نسلوں کو، مسلمانوں سے پہلے، اپنے اپنے وقت میں انسانی

زندگی کے قدرتی دستور العمل کا مخاطب و مکلف خالق کائنات نے بنایا تھا، ان سب سے مسلمانوں کا تاریخی رشتہ تکذیب و تنلیط اور تحقیر و توہین کا نہیں، قطعاً نہیں، بلکہ تصدیق و توثیق کا ہے۔ ایک ہی دیوان عشق کے ہم سبق ہم سب کے سب ہیں، ایک ہی لاہوتی کالج سب کی تعلیم گاہ ہے، حقیقی معلم اور واقعی استاد بھی سب کا ایک ہی ہے، اور بجز معمولی رو ویدل کے اصولاً تعلیمی نصاب بھی اگلوں اور پچھلوں کا اول سے آخر تک ایک ہی رہا ہے۔

قرآن نے اپنے ماننے والوں کی ذہنی تربیت ہی کچھ ایسے ذہنگ سے کی ہے کہ ہمارے پیشوا تمہارے پیشوا، ہمارے دینی بزرگ تمہارے دینی بزرگ --- یہ ہم تم کا سوال ہی، مذہب اور دین کے دائرے میں، ان کی نگاہوں کے سامنے سے ہٹ گیا ہے۔ اسی تربیت کا نتیجہ ہے کہ مسلمان دنیا کے مذہبی پیشواؤں اور بزرگوں کا جب ذکر کرتے ہیں تو سننے والا یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ خود اپنے گھر کے بزرگوں کا ذکر کر رہے ہیں یا ان لوگوں کا جن کو یہودی اپنا پیغمبر یا عیسائی اپنے دین کی سب سے بڑی ہستی تسلیم کرتے ہیں۔ دراصل گھر اور باہر کے اس فرق کو مسلمانوں کا دینی احساس پہچانتا ہی نہیں ہے۔ مسلمانوں پر روزت کو عائد کرتے ہوئے، بجائے یہ فرمانے کے کہ مسلمانوں کے دین کا یہ کوئی امتیازی سرمایہ ہے، قرآن نے صاف لفظوں میں یہ اطلاع دی ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ پہلے بھی لوگ اسی کی پابندی کرتے چلے آئے ہیں۔

قرآن اگر یہ کہتا ہے کہ پھڑے ہوؤں کو ملانا، اور اپنے بزرگوں کی راہ سے جو ہٹ گئے ہیں اسی راہ پر ان کو واپس لانا، یہ بھی اس کا اساسی نصب العین ہے، تو روزہ کے بارے میں اس بیان کی تعبیر اور کیا کی جائے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ دین کی دعوت میں لوگ دل آزاری کی راہوں کو چھوڑ کر قرآنی راستے پر اگر چلتے، تو جن قوموں کی اسلام سے محرومی کی مدت، دراز سے دراز تر ہوتی چلی جا رہی ہے، بہت مختصر ہو جاتی۔

ضرورت ہے کہ تصدیق و توثیق کے رشتے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو سمجھایا جائے کہ گزشتہ ادیان و مذاہب کے جن پہلوؤں کی تصحیح یا تکمیل کا کام قرآن نے انجام دیا ہے، اس کا صحیح مطلب کیا ہے۔ اسی موقع پر دیکھیے۔ رمضان بن کے مہینے کو روزے کے لیے متعین کرتے ہوئے، نزول قرآن کے ذکر میں، یہ فرما کر کہ نسل انسانی کی ہدایت کا سرچشمہ یہ کتاب ہے، آگے اسی کی خصوصیت کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے: *بینات من الہدی والفرقان*، ہدایت کی کھلی کھلی باتوں پر (قرآن مشتمل ہے) اور الفرقان بھی ہے۔ مطلب یہی ہے کہ مذاہب و ادیان کے بینات، یعنی واضح اور کھلے حقائق جنہیں عام طور پر لوگ جانتے ہیں، ان کے سوا قرآن الفرقان بھی ہے۔ یعنی بیرونی آمیزشوں اور خارجی

آلائشوں کو تمام مذاہب و ادیان سے جدا کرنا، سب کو پاک و صاف کرنا، یہ بھی قرآن ہی کا ایک پہلو ہے۔ اس لیے رمضان یا نزل قرآن کا مہینہ ان لوگوں کا بھی دینی مہینہ ہے جن کے پاس پہلے سے ہدایت کے بیانات نہ تھے، اور جن کے پاس کسی نہ کسی شکل میں ہدایت کے یہ بیانات باقی رہ گئے تھے، ان کے لیے یہی رمضان اس لیے دینی مہینہ بن گیا کہ قرآن کے فرقانی پہلو سے استفادے کا موقعہ ان کو بھی ملا۔ یوں رمضان ساری انسانی نسلوں، خاندانوں اور قبیلوں کا دینی مہینہ بن جاتا ہے۔

ہر حال مجھے کہنا یہی ہے کہ قرآن جیسی خود مکتبی کتاب کی اشاعت و تبلیغ کے لیے 'یا اس کی تعلیمات کی توجیہ و تاویل کے لیے' غیر قرآنی ذرائع کی دست گیری کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن آگے تو کیا بڑھتا، خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں (لأفعله اللہ) اس کا دائرہ گھٹ نہ جائے۔ اگرچہ یہ خطرہ بھی صرف دلوں کے ایک و سوا سی خطرے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

روزہ میں بسر

روزے کے متعلق یہ طریقہ تعبیر اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے تو ایام معدودات، یعنی چند گئے چنے دن 'روزہ فرض ہوا' اور بعد کو پھر رمضان کا مہینہ مقرر کر دیا گیا۔ یہ دونوں حصے ایک دوسرے سے جدا سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ دونوں دو مستقل مطالبے نہیں ہیں۔ رمضان ہی کے مہینے کو روزے کے حکم کی تعمیل کا مہینہ مقرر کرنا مقصود تھا، لیکن اسی مقصد کو پہلے عام الفاظ میں ادا کیا گیا۔۔۔ یعنی بڑی مدت روزے کے لیے نہیں بلکہ چند گئے چنے دن کی حد تک اس عمل میں مسلمانوں کو مشغول ہونا پڑے گا۔ پھر ان ہی گئے چنے دنوں کی تفصیل یہ کی گئی کہ وہ رمضان کا مہینہ ہے۔ یہ سیرکی وضاحت ہے۔

روزہ کی یہ حقیقت قابل غور ہے کہ سب سے زیادہ آدمی جن چیزوں کا عادی ہوتا ہے 'روزے کی وجہ سے اپنی اسی دوا می عادت سے دست برداری کی مشق پیدا ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دین ہو یا دنیا، زندگی کے تمام شعبوں میں اس مشق سے یہ مدد ملتی ہے کہ عادت کے خلاف کسی قسم کے مشکلات سے دوچار ہونے کا موقعہ سامنے آجائے تو روزے کی مشق ان مشکلات کو قدرتنا روزہ رکھنے والوں کے لیے آسان بنا دیتی ہے۔ اسی لیے یہ فرماتے ہوئے کہ جن رعایتوں اور جن شروط کے ساتھ روزہ کا مطالبہ واجب کیا گیا ہے ان ہی کو دیکھ کر تم یہ سمجھ سکتے ہو کہ مشقت اور دشواری میں مبتلا کرنے کا ارادہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کے مقابلے میں 'روزے کی مشق سے زندگی کے عام عادی مشکلات میں مدد ملتی ہے۔ خصوصاً قمری مہینے کی وجہ سے 'ہر موسم اور سال کے ہر حال میں روزہ رکھنے کی عادت سہولت کے دائرے میں جس وسعت کو پیدا کرتی ہے، اس کی قوت کو بڑھاتی ہے' اس کو

دیکھتے ہوئے یہی نہ جاسکتا ہے کہ روزہ سے آسانی پیدا کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے۔

شکر اور وفاقی تعلق

انسانیت، ہدایت نے جس نظام کی پابندی کر کے اپنے صحیح انجام تک پہنچ سکتی ہے، یقیناً اس کا علم ساری انسانی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے۔ روزہ اس غیر معمولی، انمول نعمت سے سرفراز فرمانے والے کی بڑائی کے اقرار کی بہترین عملی شکل ہے کہ آدمی سب سے زیادہ جن چیزوں کا رسیا اور عادی ہے، ہر ایک کو ٹھکرا کر اس پرے کے حصہ کی تعمیل کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے۔ ”ہاں کہ بڑائی کرو، اللہ کی اس نعمت کے مقابلہ میں کہ تمہاری رہنمائی اس نے کی۔“

حق تو یہ ہے کہ زندگی بھر جو ہمیں کھاتا پلاتا رہتا ہے اور طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا رہتا ہے، آدمی کا بقی چاہتا ہے کہ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرے۔ کوئی شک نہیں کہ شکر اور رکن گانے کی صورتیں یہ بھی ہیں کہ زبان سے شکر کے الفاظ، ابوت ہوں، یا، اللہ میں شکر و امتنان کے جذبات پیدا ہوں۔ لیکن کھانے پلانے والے کے شکر کی یہ شکل --- جتنی دیر کے لیے کھانا چھوڑ دینے کا حکم کھانے والے پلانے والے نے دیا اتنی دیر کے لیے ہم اس کو چھوڑ بیٹھیں --- حق تو یہ ہے کہ زبان اور دل والے شکریوں سے شکر کا یہ عملی قالب، خود شکر کرنے والوں ہی کے لیے زیادہ اطمینان بخش ہے۔ اس کی طرف آخر میں ”ہاں کہ تم شکر ادا کرو“ کے الفاظ سے اشارہ فرمایا گیا تھا۔

”جب تجھے سے پوچھیں میرے بندے میرے متعلق، تو میں قریب ہوں، جواب دیتا ہوں پکارنے والے کی پکار کا۔“ اس آیت سے پہلے بھی روزہ کا ذکر ہے اور اس کے بعد بھی۔ بیچ میں اس آیت کا ہونا یقیناً بلاوجہ نہیں ہو سکتا۔

بظاہر یہی خیال گزرتا ہے کہ حق تعالیٰ کے حکم کے مطابق جب بندہ پسندیدہ عادتوں سے دستبردار ہو کر اپنے پیدا کرنے والے کی خوشی اور اسی کی مرضی کے مطابق اپنی خوشی اور اپنی مرضی کو بنا دیتا ہے تو روزہ کے زمانہ میں روزہ دار کا خالق کائنات کے ساتھ اس وفاقی تعلق کو قرآن بتانا چاہتا ہے، معمولی حال نہ سمجھنا۔ منطقی طور پر یوں ترتیب قائم کی جائے کہ ساری کائنات حق تعالیٰ کی مرضی مبارک کے مطابق چل رہی ہے۔ انسان جب اسی عالمگیر مرضی کے مطابق اپنے آپ کو کر لیتا ہے تو اس خاص حال میں عالم کا ہر قانون انسان کی مرضی کی مطابقت کے لیے تیار ہو جاتا ہے، یعنی اس کی ہر دعا کو حق تعالیٰ قبول فرماتے ہیں۔ آپ ہی بتائیے اس کے سوا، وہ سری توقع ہی کیا کی جاسکتی ہے؟ اخذ و تلخیص، غرہ مراد، ۱۵

یومِ عید

عبد الماجد دریا بادی

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر اللہ اکبر ، وللہ الحمد۔

یہ آج ہے کیا، صبح ہی صبح تکبیر کی صدائیں، دھیمے سروں میں، تھیمے بولوں میں، ہر طرف سے کانوں میں چلی آرہی ہیں اور مسلمان ہیں کہ ٹولیوں کی ٹولیاں بنائے، نہائے دھوئے، بنے سنورے، عطر لگائے، بوڑھے اور جوان، بچہ اور بچیاں، امیر و غریب سب ادھر سے ادھر رواں ہیں؟۔۔۔ ہے یہ کہ آج عید ہے۔ سال کے دو بڑے اسلامی تہواروں میں سے پہلا تہوار، اور مسلمان اسی کا جشن منانے نکلا ہے۔ لیکن یہ کیسا جشن اور تہوار ہے، دنیا جہان کے جشنوں اور ملیوں سے نرالا کہ ناچ نہ بھرا، راک نہ باجا، بس زبانوں پر حمد کے زمزمے اور ہونٹوں پر توحید کے نغمے! جی ہاں، اللہ کے ان بندوں کی شریعت کے مزاج ہی میں بالکل متن پچھ ایسا ہے!

وارد آں آفتِ جاں حسن و جمال عجبے

چشمِ مستِ عجبے و ابرو و خالِ عجبے

(اس آفتِ جان کے حسن و جمال کی بھی عجیب شان ہے اس کی مست نگاہوں کی بھی، اس کے خال و ابرو کی بھی)۔ ابھی کل شام تک تو رمضان ہی تھا۔ ہر گیارہ مہینے کے بعد ایک پورا مہینہ بھوک اور پیاس کا صبر و ضبط کا، اب اس میں چاہے مٹی ہو یا جون، نور کے تڑکے سے لے کر شام کے جھٹ پٹے تک ۱۵ گھنٹے تک پیاس کو روکے رہیے، چاہے ہونٹوں پر چڑیاں اور زبان میں کانٹے پڑ جائیں پانی کا ایک قطرہ بھی حلق کے اندر نہ جانے دیجیے۔ اور پھر رات جب آجائے تو بجائے خواب غفلت میں پڑ جانے کے نمازیں اور زیادہ پڑھیے۔ تو ابھی کل تک تو مہینہ ہی عبادت و ریاضت کا تھا، رات کو مسجد میں، آؤت سے گونجی رہتی تھیں اور آج صبح جو ہوئی تو اس ماہ مبارک کے حسنِ خاتمہ کی خوشی میں سرزمین اور گھیاں تک کھد کی صد اوں سے گونجنے لگیں۔ عبادت تو خیر عبادت ہوتی ہے، یہاں جشنِ مسرت بھی برابر عبادت، چشمِ مستِ عجبے زلفِ دراز عجبے اور ان تکبیروں میں جاہ و جلال کی گہمی نہیں، تاہم شانِ جمال کی نرمی! زبانوں پر عبدیت کے